نظامِ اسلامی اور اطاعتِ رسولؐ

(حدیث کا مقام نظامِ شریعت میں)

نعیم صدیقی

حدیث کے اوپر حملے کی ابتدا خوارج کی طرف سے ہوئی، پھر معتزلہ نے مستقل طور پر ان کی جگہ لے لی۔ لیکن امت کے سوادِ اعظم اور اس کے چوٹی کے علماء و مفکرین نے اس فتنہ کی اس طرح مکمل سرکوبی کر دی کہ یہ دوبارہ سر اٹھانے کے لیے پورے ایک ہزار سال تک موقع نہ پا سکا۔ بدقسمتی سے ہمارے دور میں جب احیائے اسلام کا جذبہ مسلمانوں میں نمودار ہونے لگا تو اس کے متوازی اس فتنہ نے بھی پھر سر اٹھایا۔ برعظیم ہند کی تاریخ میں فتنۂ انکارِ حدیث کی ابتدا سر سید نے فرمائی، پھر اس کا عَلَم مولوی عبداللہ چکڑالوی اور مولوی محمد دین امرتسری نے اٹھا لیا، پھر عرشی صاحب اور مولینا اسلم جیراجپوری میدان میں آئے اور اب پرویز صاحب اور برق صاحب اس معرکہ کے جانباز مجاہد ہیں۔ ان حضرات نے حدیث کے خلاف از سرِ نو معرکہ بپا کرتے ہوئے قریب قریب وہی پرانے ہتھیار اٹھائے ہیں جن کو ایک مرتبہ اہلِ حق نے بالکل کند کر دیا تھا۔ یہ بات تو واضح ہے کہ یہ فتنہ کوئی مثبت طاقت نہیں ہے کہ یہ ایک دعوت و تحریک بن سکے، اس سے نتیجہ جو پیدا ہو سکتا ہے وہ صرف ذہنی انتشار ہے۔ ذہنی انتشار پیدا کرنے کے لیے بالعموم جو اسالیب کارِ مجرب ہیں ٹھیک انہی سے اس فتنہ کے علمبردار کام لے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ان سے خطاب کرنے سے ہمیشہ گریز کیا ہے اور ان کے مقابلے میں اوّل قدم پر ہی اعترافِ شکست کر لینے کو اپنے حق میں موجبِ خیر سمجھا ہے۔ مگر اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد کرتے ہوئے ہم اپنا فرض یہ سمجھتے ہیں کہ عوام کو ہر قسم کے ذہنی انتشار سے بچایا جائے۔ اسی بنا پر راقم الحروف ایک عرصے سے حدیث کے

موضوع پر قلم اٹھانے کی تیاری کر رہا تھا، لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس موضوع کے تقاضوں کے لحاظ سے اپنی علمی استعداد کو ناقص پا کر ہمیشہ تامل رہا۔ مگر بالآخر طبیعت اس پر ٹھنک گئی کہ اپنے علم کی حد تک جو ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے وہ مجھے بہرحال ادا کر دینی چاہیے۔ واضح رہے کہ اس مقالہ میں میں نے مخالفین حدیث کو جواب دینے کے بجائے اثباتی طور پر گفتگو کی ہے، اس میں جہاں کہیں تردیدی انداز آتا ہے وہاں مجبوری کا مقام ہے۔ میرے نزدیک مقالے کا حصہ اول یعنی "منصبِ رسالت" ہی اس کا اصل حصہ ہے۔ بعد کی ساری بحث اسی حصہ پر مبنی ہے (ن۔ص)

حصہ اوّل ـــــ منصبِ رسالت

نظامِ دینی میں رسول کا مقام

خدا اور رسول دنیا میں ایسے ناقص ذہن کے لوگ کم ہی پائے گئے ہیں ـــ اور اس دورِ الحاد میں بھی کم ہیں ـــ جو مطلقاً خدا کی ہستی کا انکار کرنے والے ہوں۔ آدمی جس کائنات میں پیدا ہوتا اور زندگی گذارتا ہے وہ اپنے بنانے والے کے وجود پر اتنی بدیہی شہادتیں اپنے اندر رکھتی ہے کہ ان کا انکار کرنے کے لیے سخت درجے کی بلادتِ ذہن اور ایک انتہائی اندھے پن کی ضرورت ہے۔ پوری کائنات تو بڑی چیز ہے اس عجائب خانے کا ہر شعبہ اور ہر حصہ اس کل کا ہر جزء، اس تعمیر کا ہر ذرہ، انسانی بصیرت کے لیے ایک ایسا ورقِ معرفت ہے کہ جس کی آیات اپنے مطالعہ کرنے والے کو صرف اسی حقیقت تک لے جا کر نہیں چھوڑ دیتیں کہ سورجوں اور چاندوں، دریاؤں اور پہاڑوں، ہواؤں اور گھٹاؤں، بجلیوں اور خرمنوں، کلیوں اور کانٹوں، چوپایوں اور پرندوں کی اس دنیا کا ایک بنانے والا ہے، بلکہ یہ آیات دنیا کے خالق کی بہت سی صفات کو بھی واضح کر دیتی ہیں۔ مادے اور قوت کا یہ کارخانہ بول بول کے کہ رہا ہے کہ اس کا بنانے والا اور چلانے والا کلی ارادہ و اختیار کا مالک ہے، وہ علیم و خبیر اور سمیع و بصیر ہے، وہ حکیم اور دانا ہے، وہ رحیم و کریم ہے، وہ عالم الغیب والشہادہ ہے، وہ فوق الفوق اور وراء الوراء ہے، وہ بے نیاز اور غیر محتاج ہے، وہ حی و قیوم ہے، وہ قائم و دائم ہے ـــ وہ واحد و یکتا ہے! دنیا کے اس درسِ معرفت کو جھٹلا

مینے کے بعد پھر اس قفل کی کوئی کلید نہیں رہتی، پھر اس معمے کا کوئی حل نہیں رہتا، پھر اس الجھاؤ کو سلجھانے کوئی فکری بنیاد باقی نہیں رہتی، پھر اس لفظ میں کوئی معنی پیدا نہیں کیے جا سکتے، پھر اس کُل کے اجزا میں کوئی منطقی ربط قائم نہیں کیا جا سکتا، پھر اس غزل کا نہ کوئی مطلع و مقطع رہتا ہے، نہ وزن و بحر اور نہ قافیہ و ردیف! چنانچہ انسانیت من حیث المجموع، یا بالفاظِ دیگر بنی آدم کے نوعی ذہن نے ہمیشہ خدا کے وجود کو مانا ہے، اور اس حد تک اس کی صفات کو بھی تسلیم کیا ہے!

لیکن کائنات کی آیات جب انسان کو یہاں پہنچا دیتی ہیں تو ایک اہم تر سوال خود بخود اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر خدا ہے تو اس سے انسان کا رشتہ کس نوعیت کا ہے؟ آیا اس کے کچھ مطالبات انسان سے ہیں؟ آیا وہ کوئی ذمہ داری اس پر ڈالتا ہے؟ آیا وہ اس سے کسی امر میں اطاعت و تسلیم چاہتا ہے؟ آیا وہ اسے کوئی ضابطہ و قانون دیتا ہے؟ آیا وہ اس سے کوئی حکم منوانا چاہتا ہے اور کسی شے سے اسے روکتا ہے؟ آیا وہ کسی بات سے خوش یا ناخوش ہوتا ہے؟ اگر ہوتا ہے تو کن باتوں سے؟ اس کی مرضی کیا ہے؟ اس کی پسند و ناپسند کیا ہے؟

اس سوال کا جواب دینے کے لئے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خدا خود زمین پر اتر کر آیا ہو، پھر وہ ایک ایک فردِ انسانی کے پیچھے اپنی دعوت لیے دوڑتا پھرے۔ بلکہ انسانی ہدایت کے لیے اس نے انسانوں ہی میں سے رہنما اٹھائے اور انسانی نظامِ تہذیب و تمدن کو صالح بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے اس نے خود انہی میں سے معمار کھڑے کیے۔ اصل میں آدمی کی فطرت اور اس کی ساخت ایسی نہیں ہے کہ حقیقتِ مطلق کا ادراک براہِ راست کر سکے۔ اس کے حواس اطلاق کی فضاؤں میں بالکل جواب دے دیتے ہیں، وہ کسی پیغام کو بھی اخذ کر سکتا ہے کہ وہ تعینات و تحدیدات کے سانچوں میں ڈھال کے اس کے سامنے لایا جائے۔ یہی نہیں، اس کی فطرت کے تقاضے اس طرح بھی پورے نہیں ہو سکتے کہ فرشتے اس کے سامنے دعوت کا علم اٹھائیں اور اس کی قیادت کا فرض سرانجام دیں۔ اس کا محدود دماغ اپنی فکر کے چراغ براہِ راست انوارِ الٰہی سے کبھی روشن نہیں کر سکا بلکہ وہ عقیدہ و ایمان کے دئے صرف اس شعلۂ حقیقت سے جلا سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے انسانی دماغوں ہی کے اندر فروزاں کیا ہے۔ آدمی کو جو کان دئے گئے ہیں وہ اللہ کی آواز کو اسی

صورت میں سُن سکتے ہیں جبکہ وہ انسانی آلاتِ نطق سے بلند ہوئی ہو اس کے جذبات میں تاثر بھی پیدا ہوتا ہے جب کہ اللہ کی پسند و ناپسند پہلے انبیا کے اندر مطلوبہ انسانی جذبات کی لہریں اٹھا دے، وہ اخلاقی نمونہ اگر حاصل کر سکتا ہے اور سیرت کا کوئی چربہ لے سکتا ہے تو نہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے، اور نہ اس کے فرشتوں یا کسی دوسری فوق الانسانی مخلوق سے، بلکہ اپنے ہی جیسے انسانی افراد سے لے سکتا ہے۔ جب کبھی بھی اللہ کے دین کی بنیادوں پر منظم ہوا ہے تو اپنی فطرت کی محدودیتوں کی وجہ سے خود اپنی ہی کی طرح کے کسی انسان کے گرد منظم ہوا ہے اور اسلامی انقلاب کا سپاہی جب بھی وہ بنا ہے تو اپنے ابنائے نوع کے زیر قیادت ہی بنا ہے[۱]۔ انسانی فطرت کی انہی خصوصیات کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں بہترین افرادِ انسانی کو اس مقصد کے لیے منتخب کیا ہے کہ ایک طرف ان کے قلوب اللہ تعالیٰ سے الہام حاصل کریں اور دوسری طرف وہ عام انسانوں کے لیے الہامی دعوت کے دیانت دار ترجمان اور انسانی پیکر میں اس کے تفصیلی تقاضوں کا عملی مظہر ہوں۔

"پس کائنات خدا کے وجود اور اس کی بعض صفات کی گواہی دے دینے کے بعد انسان کو جس مقام پر چھوڑ دیتی ہے اس مقام سے آگے چلنے کے لیے یعنی خدا کی مرضی، اس کی ہدایت، اس کے قانون، اس کی پسند و ناپسند کو معلوم کر کے زندگی کو اس کے مطابق بنانے کے لیے انبیا کا مرہونِ منت ہونے بغیر چارہ نہیں۔ خدا کی ہستی کی محدود سی معرفت کے لیے تو انفس و آفاق کی آیات مدد دیتی ہیں، لیکن اس کی طاعت کے لیے رسالت کا دامن تھامنا ناگزیر ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسانی زندگی کی صلاح و فلاح مجرد ایمان باللہ پر منحصر نہیں ہے بلکہ ایمان بالرسالت بنیادی طور پر اس کے لیے ضروری ہے۔ فکر کا نہاں خانہ اگر مظاہرِ کائنات کے چراغوں سے کسی قدر روشن ہو بھی جائے تو بھی عمل کی وادیاں اس وقت تک اندھیری رہتی ہیں جب تک کہ انبیا کے جلائے ہوئے دیوں سے ان کو منور نہ کیا جائے۔ محض خدا کے تصور کے بل پر زندگی

---

[۱] یہ حقیقت دینِ حق ہی کے لیے خاص نہیں بلکہ اگر شیطان بھی اگر اپنا کوئی دین انسانوں میں چلانا چاہے تو وہ بھی اس کام کے لیے انسانوں ہی کے اندر سے داعی اور لیڈر اور نمونہ کے پیشوا تیار کرتا ہے۔

—— اور نظام زندگی —— کی تعمیر ممکن نہیں ہے۔ بلکہ خدا کے تصور کو سنگِ اساس کی حیثیت دے کر جب اس تعمیر کو برپا کرنا ہو تو اس کا سارا مسالہ اور اس کا فنِ تعمیر اور اس کا نقشۂ تعمیر صرف انبیا ہی کے ذریعے مل سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی فکر کے حاملین نے بالاتفاق یہ حقیقت تسلیم کی ہے کہ ایمان بالرسالت کے بغیر ایمان باللہ بے کار ہے، جیسے کسی شاہنشاہ کی وفاداری کا اقرار بغیر اس کے مقرر کردہ وائسرائے یا گورنر یا چیف جسٹس یا جرنیل کی وفاداری کے عملاً بے کار ہے۔ مجرد ایمان باللہ (بلکہ یوں کہئے کہ ایمان بر ذاتِ الٰہی) ایک جامد عقیدہ ہے کہ جس سے نہ عملی زندگی کا درخت نمودار ہو سکتا ہے اور نہ اس پر پھل آ سکتا ہے۔ اس عقیدے کے بیج سے اگر عملی زندگی کا درخت اُگ سکتا ہے اور اگر اس پر برگ و بار آ سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ تعلیماتِ انبیا سے اس کی آبیاری کی جائے! محض ایمان باللہ سے تصوف پیدا ہو سکتا ہے، یوگ پیدا ہو سکتا ہے، رہبانیت پیدا ہو سکتی ہے، لیکن کوئی نظامِ زندگی، کوئی تہذیب، کوئی معاشرت، کوئی تمدن اور کوئی معیشت پیدا نہیں ہو سکتی۔ ایمان باللہ سے نظامِ زندگی اسی صورت میں رونما ہوتا ہے جبکہ ایمان بالرسالت ساتھ کے ساتھ موجود ہو۔ رسالت کا انکار کرنے کے بعد خدا کا تصور ایک ایسا خاکہ بن کے رہ جاتا ہے جس میں ہر کوئی اپنے من ملنے رنگ بھر سکتا ہے، اس کے ساتھ جو صفات چاہے منسوب کر سکتا ہے، اپنے فلسفیانہ قیاس اور اپنے متصوفانہ تخیل سے جس ضابطہ کو چاہے اس کے نام سے اپنے سامنے رکھ سکتا ہے، اور اس کی پسند و ناپسند اور رضا اور ناراضی کا جو تصور چاہے قائم کر سکتا ہے۔ پھر خدا کی مرضی اور اس کے احکام کوئی ایسی حقیقت نہیں ہو سکتے جس پر ساری انسانیت تو کجا، دو آدمی بھی ہم خیال ہو سکیں۔

بات اتنی ہی نہیں کہ ایمان باللہ کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ایمان بالرسالت بنیادی اہمیت رکھتا ہے بلکہ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ خدا کی اطاعت منحصر ہی نبی کی اطاعت پر ہے۔ خدا نے اپنے رسولوں کو اتنی بڑی اتھارٹی دی ہے کہ جو کوئی اس کی مرضی پوری کرنا چاہے وہ انبیا کی بے چون و چرا اطاعت کرے، اور جس نے ان کی اطاعت سے انحراف کیا اُس نے خود خدا سے بغاوت کی۔ جو اُن کا ہوا وہ خدا کا ہے اور جو ان کا نہیں وہ خدا کا بھی نہیں۔ جس نے ان کے بتائے ہوئے حلال و حرام کو تسلیم نہ کیا

اس نے گویا خود اللہ ہی کے ضابطے سے منہ موڑا جس نے اُن کی ہدایات کا اتباع نہ کیا اس نے خود اللہ ہی کا قانون پامال کر ڈالا۔ نبوت و رسالت کا منصب ہے ہی ایسا کہ اس کے ساتھ اتنی ہی بڑی اتھارٹی ہونا لازم ہے۔ خدا کو اپنے بندوں سے جو بات بھی کہنی ہے اس کا واسطہ نبی یا رسول ہی کے آلاتِ نطق ہیں؛ وہ اپنے بندوں کو جو طرزِ فکر اور جو زاویہ نگاہ دینا چاہتا ہے اس کا مظہر نبی یا رسول ہی کا ذہن ہے، وہ اپنے بندوں میں جیسے جذبات پیدا کرنا چاہتا ہے ان کی لہریں سب سے پہلے انبیاء و رسل ہی کے قلب سے اٹھاتا ہے، وہ جس سیرت و اخلاق کو پسند کرتا ہے اس کا معیار وہ انبیاء و رسل ہی کو بناتا ہے، وہ جس تحریکِ خیر و فلاح کو تاریخ انسانی میں برپا رکھنا چاہتا ہے اس کے لیے انبیاء و رسل ہی کو بدرقہ (Pillars) بناتا ہے اور وہ جس تہذیب و تمدن کو انسانی ارتقاء کے لیے موزوں قرار دیتا ہے اس کی تعمیر کا کام انبیاء کی ہی نگرانی میں کراتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انبیاء مرضیٔ الٰہی کے مستند نمائندے ہوتے ہیں اور ان کا ہر قول و فعل اپنے پیچھے بڑی اتھارٹی رکھتا ہے۔

"الکتاب" اور "الرسول" سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں نہ ایسا ہوا کہ مرضیٔ الٰہی کو واضح کرنے والی ایک لکھی لکھائی کتاب آسمانوں سے اتر آئی ہوتی، یا اس کے نسخے ایک ایک فردِ انسانی پر اتار دیے جاتے، یا کوئی غیبی قوت ایک بھاری آواز کے لاؤڈ سپیکر سے دعوتِ الٰہی کو بیک دم ساری دنیا کو سنا دیا کرتی؟ خدا، آمرِ مطلق، حاکم لاشریک اور واحد سرچشمۂ قانون کی شان کے یہ منافی معلوم ہوتا ہے کہ کسی فردِ انسانی کو یہ اتھارٹی دے کر بھیجا جائے کہ اس کا لفظ لفظ خدا کی مرضی کا بیان تسلیم کیا جائے، اس کا ایک ایک فعل خدا کی طرف سے واجب تقلید نمونہ مانا جائے اور اس کے ہر اشارۂ ابرو کے ساتھ حرکت کی جائے۔ سرے سے اس کی ضرورت ہی کیا تھی؟ خدا نے جب اپنی مرضی کو واضح کرنے کے لیے کتابیں نازل کی ہیں تو پھر رسولوں کو نازل کرنا ایک زائد از ضرورت فعل معلوم ہوتا ہے!

اس سوال کے جواب تک پہنچنے سے پہلے ایک اور سوال غور طلب ہے۔ وہ یہ کہ آیا مجرد ایک کتاب انسانی ہدایت کے لیے کافی ہو سکتی ہے؟ اس چیز کو سوچیے اور عملی زندگی سامنے رکھ کر سوچیے۔ کیا کوئی ضخیم سے ضخیم کتاب پوری انسانی زندگی ——— بلکہ اس کے کسی ایک شعبے ——— کے پورے عملی

تقاضوں کو سمیٹ سکتی ہے؟ کیا وہ لوگوں کو از خود اپنے پورے مندرجات کے پڑھنے پر آمادہ کرسکتی ہے؟ کیا وہ ایک زندہ داعی کے جذباتِ اخلاص کا خلا پوری طرح بھر سکتی ہے؟ کیا وہ اپنے قارئین کے تمام کے تمام سوالات واعتراضات اور شکوک وشبہات کے جواب پیشگی اپنے اندر موجود رکھ سکتی ہے اور اس کے جوابات سے پھر مزید جن سوالات کا پیدا ہونا ممکن ہو کیا ان کو اور اسی طرح ان سے آگے کے سوالات وجوابات کی پوری نسل کو بھی محیط ہوسکتی ہے؟ کیا وہ اپنے نظریہ کے مطابق کسی عملی نمونہ کو دکھائے بغیر لوگوں کو یہ اطمینان دلا سکتی ہے کہ اس کی دعوت نری تخیلاتی (Utopian) نہیں ہے کیا وہ درجۂ اول، درجۂ دوم اور درجۂ سوم کے مختلف دماغوں کے لیے یکساں مؤثر اور یکساں قابلِ فہم اور یکساں قابلِ اطمینان ہوسکتی ہے؟ کیا وہ اپنے متاثرین کو سمیٹنے، سنبھالنے، منظم کرنے، ان کا تزکیہ کرنے، ان کے اخلاق بنانے، ان کو موقع بہ موقع ہدایات دینے، ان کو قدم قدم پر ٹوکنے، ان کو مشکلات میں تسلی دلانے، ان کو کامیابی کے مراحل پر کبر سے بچانے اور مصیبتوں کے مقابلے میں ان کی ہمت بندھانے کا کام اسی طرح کرسکتی ہے جس طرح ایک زندہ داعی کرسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔

اگر ہمارا یہ منفی جواب صحیح ہے تو ہماری عقل تقاضا کرتی ہے کہ انسانی زندگی میں جب بھی دعوت کا کوئی کام کیا جائے تو یہ کام فکر اور عمل دونوں میدان میں ہونا چاہیے اور اس کے لیے کتابی دعوت کے ساتھ ساتھ کسی زندہ داعی کو بھی میدان میں آنا چاہیے۔

اگر معاملہ محض مذہب اور دھرم اور مت کا ہوتا تب تو شاید کسی حد تک یہ صورت بھی نتیجہ خیز ہوسکتی کہ ایک کتاب میں مختصراً چند عقاید، پوجا پاٹ کی چند رسموں اور اخلاق کے موٹے موٹے قاعدوں اور ضابطوں کی فہرستیں درج کرکے انسانیت کے حوالے کردی جائیں، لیکن چونکہ یہاں سوال پوری انسانی زندگی کی اصلاح کا، ایک پورے نظامِ تہذیب وتمدن کا، ایک ہمہ گیر دعوت وتحریک کا ——— بالفاظ دیگر ایک دین کا ——— درپیش ہے، لہٰذا یہاں کتاب کے ساتھ ایک حاملِ کتاب کی ضرورت بھی ہے۔ چنانچہ ہر دورِ تاریخ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کی رہنمائی وہدایت کا جو انتظام کیا گیا وہ ہمیشہ مشتمل تھا "الکتاب" اور "الرسول" پر۔ الکتاب نے ہمیشہ بنیادی فکر پیش کی اور الرسول نے اس فکر

کے مطابق عملی زندگی کا مظاہرہ کیا، الکتاب نے انسان مطلوب کا خاکہ پیش کیا، اور الرسول نے انسان مطلوب بن کر دکھایا، الکتاب نے دعوت پیش کی اور الرسول نے تحریک چلائی اور نظام اجتماعی کی تشکیل کی، الکتاب نے بنیادیں فراہم کیں اور الرسول نے عمارت اٹھائی، الکتاب نے اصول دئیے اور الرسول نے ان اصولوں کے سانچے میں معاشرے کو ڈھالا۔ پس دین اور ہدایت اور اسلامی نظام زندگی کا شعور حاصل کرنے کے لیے جتنی اہمیت الکتاب کی ہے اتنی ہی الرسول کی ہے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے منفک نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں ایک ہوگا وہاں دوسرے کا ہونا بھی ضروری ہے اور جہاں ایک نہ رہے وہاں دوسرا بھی نہ رہے گا۔

اَطِیعُونِ کا مطالبہ خدا کے دین کو برپا کرنے میں انبیاء اور رسل کو جو اتھارٹی خود خدا کی طرف سے دی گئی ہے وہ انسان کے لیے سب سے اونچی اتھارٹی ہے۔ نبی اور رسول خدا کی طرف سے بات کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ وہ اس کی منشا کا نمائندہ ہے، وہ اس کی پسند و ناپسند کا واضح کرنے والا ہے، وہ اس کی طرف سے حلال و حرام کی تفریق کرنے پر مامور ہوتا ہے، وہ اس کے اوامر و نواہی کی تعبیر و تفصیل کرتا ہے، وہ اس کے دئیے ہوئے اصولوں کو عملی حالات پر منطبق کرتا ہے، مختصر یہ کہ وہ اسکی اطاعت کا نمونہ اور بحیثیت سے اس کی اطاعت کرانے والا ہوتا ہے۔ اس اتھارٹی کے تحت ہی مطالبہ وہ یہ کرتا ہے کہ،

اِتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیعُونِ! خدا سے ڈرو، اور میری پیروی کرو!

یعنی ایمان باللہ سے جو ذہنیت بنی چاہیے وہ یہ ہوتی ہے کہ آدمی اپنے لیے ایک خالق، ایک رب، ایک آقا، ایک ہادی اور ایک قانون ساز کا وجود تسلیم کرے، اس کے سامنے جوابدہی اور ذمہ داری کو محسوس کرے، اور اس کی پسند کو اختیار کرنے اور اس کی ناپسند سے بچنے کی فکر کرے — لیکن اس ذہنیت کے مطابق عملی زندگی کو ڈھالنے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہے کہ وہ ہمہ تن اپنے آپ کو خدا کے نبی و رسول کے حوالے کر دے اور کامل اعتماد کے ساتھ حوالے کر دے۔ مطالبہ محض خدا کی کتاب کے مندرجات کو سامنے رکھنے کا نہیں ہے بلکہ خدا کے انبیاء و رسل پوری اتھارٹی سے تقاضا

سلہ پہلی چیز تقویٰ کی حس ہے اور دوسری چیز متبعانہ مسلک!

یہ کرتے ہیں کہ "اطیعون": ہماری اطاعت کرو! ہم جس چیز سے روکیں اس سے رک جاؤ، ہم جس روش کو اختیار کریں اسے اختیار کر لو، ہم جسے حرام کہیں اسے حرام مانو، ہم جسے حلال قرار دیں اسے حلال تسلیم کرو، ہم جو نمونہ سامنے رکھیں اسے قبول کر لو، ہم جو قدریں پیش کریں ان کو زندگی کا جوہر بنا لو، ہم تم کو جس سانچے میں ڈھالنا چاہیں اس میں بے چون وچرا ڈھل جاؤ۔ چنانچہ نوح علیہ السلام آتے ہیں تو کہتے ہیں: اتقوا اللہ واطیعون (الشعراء، ع ۶۔ نوح ع) ہود علیہ السلام آتے ہیں تو مطالبہ کرتے ہیں کہ: اتقوا اللہ واطیعون (الشعراء، ع ۷) پھر صالح علیہ السلام یہی دعوت دیتے ہیں (الشعراء، ع ۸)۔ پھر لوط علیہ السلام اپنی یہی اتھارٹی پیش کرتے ہیں (الشعراء، ع ۹) پھر شعیب علیہ السلام یہی تقاضا کرتے ہیں کہ خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو (الشعراء، ع ۱۰)

آخر ایسا کیوں نہ ہوا کہ اطاعت کا مطالبہ صرف اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہوتا یا اس کی کتاب کے لیے ہوتا، اور انبیاء و رسل اس طرح کی اتھارٹی کے ساتھ اپنی اطاعت کا مطالبہ کرنے کے بجائے صاف صاف یہ کہتے کہ رسول تو ہم صرف اس حد تک ہیں کہ خدا کا پیغام (یعنی اس کی کتاب) تم تک پہنچا دیں؛ اس کے بعد ہم بھی تمہاری طرح محض پیروکار ہیں اور .... اطاعت کرانے کے لیے نہیں اطاعت کرنے کے لیے آئے ہیں۔ آخر اس "اطیعون" کی کوئی اہمیت ہے اور اس کے اندر کوئی حکمت ہے؟ اس اطیعون کا صاف مطلب یہ ہے کہ محض "اتباع کتاب" سے خدا کا منشا اور اس کے دین کے تقاضے پورے نہیں ہوتے، بلکہ پہلو کچھ ایسے بھی ہیں جن پر کتاب حاوی نہیں ہو سکتی اور ان کے لیے ایک زندہ پیشوا کی ضرورت ہے[1]۔

دوسرے تمام انبیاء و رسل کی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی مطالبہ یہی ہے کہ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول اور یہ مطالبہ قرآن میں ایک مقام پر نہیں کتنے ہی مقامات پر دہرا دہرا کر مسلمانوں سے

۱۔ چنانچہ کسی ایک موقع پر بھی "اطاعت کتاب" کا مطالبہ نہیں کیا گیا، بلکہ کتاب کے لیے "اتباع" کا حکم آیا ہے۔ اطاعت اصلاً اللہ کے لیے، اور اللہ کے اذن کے تحت "رسول" کے لیے چاہی گئی ہے، کیونکہ اتباع کے بخلاف اطاعت کا مستحق وہ ہو سکتا ہے جو امر و نہی کر سکے۔ اطاعت جواب ہے امر کا۔ کتاب صاحب امر نہیں، اور رسول اللہ کی طرف سے صاحب امر ہوتا ہے۔

سامنے لایا گیا۔ ان مواقع پر کسی گرامر اور کسی بلاغت کے اصول سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ اطیعوا اللہ اور اطیعوا الرسول بالکل مترادف باتیں ہیں۔ کونسی منطق یہ ثابت کر سکتی ہے کہ اطیعوا اللہ سے بھی مراد کتاب اللہ کی اطاعت ہے اور اطیعوا الرسول سے مراد بھی محض کتاب اللہ ہی کی اطاعت ہے[1]۔ اگر ایسا ہو تو سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ بعض مقامات پر صرف اطاعت الٰہی، بعض پر صرف اطاعت رسول اور پھر بعض مقامات پر اطاعت الٰہی اور اطاعتِ رسول دونوں کا یکجائی مطالبہ جو پایا جاتا ہے تو آخر انداز بیان کے اس فرق کی توجیہ کیا ہو گی! سیدھی بات جسے ایک اوسط درجے کا انسانی ذہن بھی پا سکتا ہے یہ ہے کہ اطاعت الٰہی کے لیے جتنا ضروری یہ ہے کہ اللہ کی کتاب کے لفظ لفظ کو پیش نظر رکھا جائے اتنا ہی لازم یہ بھی ہے کہ اللہ کے رسول کے ہر قول و فعل کو بھی اسوہ اور نمونہ مان کر قبول کیا جائے۔ اللہ کی اطاعت الکتاب کے اتباع اور الرسول کی اطاعت پر یکساں منحصر ہے! الکتاب اگر اللہ کے طے کردہ اصول سامنے لاتی ہے تو الرسول ان اصولوں کی مستند عملی تعبیر پیش کرتا ہے۔ یہ ہے وجہ اطیعوا اللہ کے بعد اطیعوا الرسول کہنے کی!

یہ بات اسلامی نظامِ فکر و عمل ہی کے لیے خاص نہیں ہے کہ اسے برپا کرنے کے لیے کتاب کے ساتھ ... رسول کا ہونا لازم تھا، بلکہ کوئی اور تہذیبی تحریک بھی کبھی محض کتاب کے زور سے اور بدون کسی زندہ داعی کے پروان نہیں چڑھی اور کسی نوعیت کا نظامِ اجتماعی بھی نری کتابی فکر کے بل پر اور بلا کسی انسانی قیادت کے برپا نہیں ہوا۔ اپنے اس دور میں سے ہم اگر اشتراکی نظام کی مثال لے کر دیکھیں تو کون نہیں جانتا کہ کارل مارکس کی کتاب "سرمایہ" دنیا کی ان چند مانی ہوئی کتابوں میں سے ہے جنہوں نے تاریخ انسانی میں بڑے بڑے تغیرات پیدا کر دئیے ہیں اور کم سے کم ملحدانہ فکر کی وادی میں وہ ایک نمایاں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر اس کتاب کے متعلق یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اپنے موضوع پر انسانی سعی کے لحاظ سے یہ ایک مکمل کتاب ہے۔ مگر اس کتاب کی انقلاب انگیز فکر اس وقت تک کچھ نہ کر سکی جب تک کہ اس کو تحریک چلانے والا موزوں داعی لینن کی شکل میں نہ مل گیا۔ لینن کے

---

[1] یہ بات ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ کتاب کے لیے اطاعت کا مطالبہ سرے سے کیا ہی نہیں گیا۔

علاوہ یورپ میں اس کتاب کی فکر کو لے کر کچھ اور لوگ بھی اٹھے لیکن اس فکر کے عملی تقاضے پورے نہ کر سکنے کی وجہ سے ناکام ہو گئے۔ تاہم یہ تو بالکل واضح ہے کہ "سرمایہ" تو کجا خود اس کا مصنف بھی اپنی پیش کردہ فکر کو عملی تحریک میں نہ ڈھال سکا۔ کتاب ایک لینن کا انتظار کرتی رہی، جب وہ نمودار ہو گیا تو کتاب کے خیالات اوراق سے نکل کر میدان عمل میں آ گئے۔

اس مثال سے غلط فہمی نہ ہو کہ بات تشبیہ تام کے انداز سے ہو رہی ہے۔ ہرگز نہیں! مارکس مخلوق تھا اور بے بس، مارکس سے بے شمار کوتاہیاں ہوئیں کہ جن کو پورا کرنے کے لیے بعد کے لوگوں نے کام کیا، مارکس کے نظریات بجائے خود قطعی حقیقت نہ تھے اور نہ ان میں کوئی تقدس تھا کہ ان میں قطع و برید کرنا دوسروں کے لیے حرام ہوتا۔ کجا مارکس کی کتاب اور کجا کتب الٰہی! کجا لینن اور کجا انبیاء و رسل! چہ نسبت خاک را با عالم پاک! یہاں ذکر صرف اس چیز کا ہے کہ نہ اسلام کی تاریخ میں اور نہ الحاد کی تاریخ میں کوئی مثال اس امر کی مل سکتی ہے کہ محض کتاب نے داعی اور لیڈر اور مصلح اور معلم کی حیثیت میں کوئی تحریک چلا دکھائی ہو، یا کوئی نظام اجتماعی قائم کر دیا ہو۔ ہر فکر اپنے ظہور کے لیے، ہر دعوت تحریک بننے کے لیے اور ہر اصولی فلسفہ ایک نظام زندگی کی شکل اختیار کرنے کے لیے اپنے مزاج کی لیڈر شپ کا محتاج ہے۔ انسانی سوسائٹی تبدیلی قبول ہی اسی طرح کرتی ہے۔ وہ محض کتابوں کے ذریعے نہیں بدلتی بلکہ کتابوں کی فکر جب کسی عملی انسان میں جلوہ گر ہوتی ہے تب وہ اس کے مطابق ڈھلنے کے لیے تیار ہوتی ہے۔

انسانی پیکر میں عملی نمونے کی ضرورت یہ بھی ہے کہ وہ کسی فلسفے کو زندگی کے روزمرہ کے مسائل پر منطبق کر کے دکھائے۔ عملی نمونے کی ضرورت اس لحاظ سے بھی ہے کہ وہ کسی پروگرام کا قابل عمل ہونا ثابت کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ عملی نمونے کی ضرورت اس پہلو سے بھی ہے کہ اس کے ذریعے دعوت کے مخاطبین میں عملی قوائے بیدار ہوتے ہیں۔ عملی نمونے کی ضرورت یوں بھی ہے کہ لوگ ایک آئیڈیل کو محسوس شکل میں سامنے رکھ کر اس کے مطابق ارتقا کریں۔ تو ان ساری ضرورتوں کا خلا کتاب پُر نہیں کر سکتی۔

بہرحال انسانی فطرت اور انسانی سوسائٹی کے مزاج کا یہی تقاضا تھا کہ خدا نے اسکی ہدایت کا جب کبھی سامان کیا تو محض الکتاب کی تنزیل پر اکتفا نہ کی بلکہ الرسول کی ترسیل بھی فرمائی، دعوت بھیجی تو داعی بھی ساتھ بھیجے فکر دی تو اس کے مطابق تحریک چلانے والے لیڈر بھی دیئے، نظام زندگی کا نقشہ بتایا تو اسکے ساتھ اجتماعی زندگی بھی عملاً موجود فرمائے! (باقی آئندہ)